تنقید و تبصرہ

اسلامی نظریۂ حیات

مولفہ خورشید احمد لیکچرار کراچی یونیورسٹی

ناشر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی کراچی

جہاں تک اسلام کی فکری و نظریاتی بنیادوں کا تعلق ہے کراچی یونیورسٹی مستحق مبارک باد ہے کہ اس نے اس موضوع پر یہ کتاب شائع کی، جو صرف جامعات اور کالجوں کے نوجوان طالب علموں کو اسلام کے ان پہلوؤں کے متعلق وہ سب معلومات فراہم کرے گی، جن کی انہیں آج سخت ضرورت ہے، بلکہ ملک کے عام تعلیم یافتہ اردو داں حضرات بھی استفادہ کر سکیں گے مؤلف نے مضامین کے انتخاب میں غیر معمولی حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ اور کوشش یہ کی ہے کہ اسلام کے بارے میں ان سب مباحث پر اصحاب علم و فکر کے آراء و افکار آجائیں۔ جو آج کل علمی و تعلیمی حلقوں کے موضوع بنے ہوئے ہیں اور ان کے متعلق اکثر بحثیں ہوتی ہیں۔

"اسلامی نظریۂ حیات" کے مندرجات دینی و علمی لحاظ سے تو ایمان افروز، خیال پرور اور مفید ہیں ہی، نیز ان میں تنوع اور جامعیت دونوں ہیں، لیکن ان کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی اپنی ایک ادبی حیثیت بھی ہے اور قاری اسے پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ گویا ایک ادبی کتاب پڑھ رہا ہے۔ تمام مندرجات کا اسلوب بیان اور زبان ادبی چاشنی لئے ہوئے ہے اور ان میں بڑی روانی ہے۔ غرض، یہ کتاب دینی حس کی بھی تسکین کرتی ہے اور اس میں ادبی حس کی تسکین کا پورا اہتمام ہے۔

خورشید صاحب نے کتاب کا آغاز اسلام کی اس تعریف سے کیا ہے:-

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے، جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو۔ اور جس کا کل سرمایۂ حیات کچھ عبادات، چند افکار اور چند رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جو خدا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی صورت گری کرتا ہے۔ اور زندگی کے ہر پہلو کو خدا کے نور سے منور کرتا ہے۔ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو

> یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو سیاسی اور ملکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری و ساری ہو اور دل کی دنیا سے لیکر تہذیب و تمدن کے ہر گوشے تک خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔"

مرتب نے مذکورہ بالا الفاظ میں اسلام کی جو تعریف کی ہے، کتاب کے تمام مندرجات دراصل اسی جامع تعریف کی تفصیل ہیں اور ہر صاحب قلم نے اسی نقطۂ نظر سے اسلام کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث کی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بحث کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور اس سلسلے میں جن جن شکوک و شبہات کا ان دنوں اظہار ہوتا ہے۔ ان کا جواب دیا ہے۔

جہاں تک مذہب کی ضرورت، مذاہب عالم میں اسلام کی برتری۔ اور اس ضمن میں اسلام کے تصور زندگی۔ "اسلام نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات"۔ اسلام کے بنیادی عقائد" توحید" رسالت" اسوۂ حسنہ" عقیدہ آخرت" اور اسلامی تصور عبادت" اور اسلامی عبادات کے مباحث کا تعلق ہے، کوئی منصف مزاج غیر مسلم اور تعصب سے خالی مسلمان ان کے مندرجات کی افادیت اور حقانیت سے انکار نہیں کر سکے گا۔ اور پروفیسر عبدالحمید صدیقی نے "دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب" کے باب میں تہذیب جدید اور اس کے معانی و مقاصد و مظاہر پر جس عالمانہ و محققانہ اور موثر طریقے سے کڑی تنقید کی ہے اسے پڑھنے کے بعد اگر کسی کے ذہن میں اشتمالیت یا مغربی جمہوریت کے لئے کوئی وجہ کشش ہوگی، تو اسے لامحالہ اپنے مزعومات پر نظر ثانی کرنا ہوگا۔ اور اس کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ "اسلامی نظریہ حیات" کی برتری کو مانے۔

مرتب کے الفاظ میں یہ سب تھی "اسلام کی علمی اور فکری بنیادوں اور دور حاضر کے پیدا کردہ مسائل پر گفتگو" جس کا ماحصل موصوف کے الفاظ میں یہ ہے کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت صحت مند نظریۂ حیات ہے۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راہیں بھی انسان نے اختیار کی ہیں، بالآخر وہ سب غلط اور تباہ کن ثابت ہوئی ہیں عقلی تجزیہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر زندگی حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان اور امن و امان سے مالا مال نہیں ہو سکتی۔ اور وہ مذہب جو اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے اور جو زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اسلام ہے" اس کے بعد مسئلہ آتا ہے۔ "اسلامی نظام حیات" کا جس پر کتاب کے حصہ سوم میں بحث ہے۔ اس کی تمہید میں خورشید صاحب لکھتے ہیں "اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے، وہ محض انسانی عقل اور تجربہ کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا، بلکہ ابتدائی اور اولین رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور ان کی روشنی میں عقل اور تجربہ کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔"

غرض اسلام کی رو سے زندگی کا جو نقشہ تجویز ہوگا، گو اس کے لئے ابتدائی اور اوّلین رہنمائی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے ہی حاصل کرنا ہوگی، لیکن جیسا کہ خورشید صاحب نے لکھا ہے اس میں انسانی عقل اور تجربہ سے مدد لینا پڑے گی اور وہ اس لئے کہ

قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے، بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے، اس کا اصل کام یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے، لیکن وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بناتا۔ بلکہ وہ ہر شعبہ زندگی کے حدود اربعہ بنا دیتا ہے۔ (صفحہ ۳۳۹)

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔۔۔ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے" لیکن اسلامی زندگی کے نقشے کی تجویز کے سلسلے میں "اجتہاد" کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ماتحت براہ راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش کر کے کتاب و سنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے اس ضمن میں مؤلف کے نزدیک "اجتہاد" کو جو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ کتاب کے اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلّم ہے۔ کیونکہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دوچار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے، تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے ٹوٹ جائیگا۔ اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قائم رہتے ہوئے گوارا نہیں کر سکتا۔ ہماری روحانی و ایمانی زندگی کے لئے اس سے کہیں زیادہ ضرورت "اجتہاد" کی ہے جتنی ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لئے ہوا اور پانی کی ہے۔"

زیر نظر کتاب میں خورشید صاحب نے مثال کے طور سے "اسلام کا جو سیاسی نظام" پیش کیا ہے ظاہر ہے وہ اجتہادی کا نتیجہ ہے کیونکہ سیاسی زندگی کے یہ مسائل اس دور کے ہیں اور ان کے بارے میں "عقل اور تجربہ کی روشنی" ہی میں احکام معین کئے گئے ہیں، گو اس ضمن میں، یہ مان لیا جا سکتا ہے "ابتدائی اور اولین رہنمائی ضرور خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت" سے حاصل کی گئی ہوگی۔ لیکن احکام کی یہ معین صورت اجتہاد ہی کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا یہی باب ہمارے نزدیک محل نظر ہے اور اس میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی دینی حیثیت کے بارے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ مرتب کا اپنے اس مجوزہ سیاسی نظام کو "اسلام کا سیاسی نظام" کہنا ٹھیک نہیں مثلاً صفحہ ۴۰۷ پر ارشاد ہوتا ہے "اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر۔ نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق" یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ آیا اس عالم آب وگل میں اس طرح کی ریاست عملاً وجود پذیر ہو سکتی ہے ؟ اور خود مؤلف نے اسی باب کے شروع میں جس سے یہ عبارت لی گئی ہے، ریاست کی تعریف یوں کی ہے "ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے، جس کے ذریعہ ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے ہیں ۔"

معلوم ہوتا ہے مؤلف کو شاید خود بہ تضاد کھٹکا ہے چنانچہ یہ سب کچھ لکھنے کے بعد ہی وہ فرماتے ہیں کہ "ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے ۔" غرض یہ ہے کہ اسی کو تو عام اصطلاح میں وطن کہتے ہیں ایک ملک یا وطن کے بغیر ایک ریاست کا تصور ایسا ہی ہے، جیسے کہ ایک انسان کا جسم کے بغیر تصور ہو۔ بے شک ایک ریاست ایک معین ملک اور وطن رکھتے ہوئے ایک نظریاتی و اصولی ریاست ہو سکتی ہے، جیسے ایک شخص ایک شہر، ایک صوبے اور ایک ملک کا باشندہ ہوتے ہوئے بین الاقوامیت اور انسانیت عامہ کا حامل ہو سکتا ہے اور دونوں میں کوئی تضاد نہیں - اور ہم بیک وقت پاکستانی بھی ہو سکتے ہیں اور مسلمان بھی ۔

آگے چل کر مؤلف "سیکولرزم" کی تعریف یوں کرتے ہیں - "یہ اس نظام کو کہتے ہیں، جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو، لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آ جاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری کا داعی ہے ۔" اس پر بڑی تفصیل سے بحث کرنے کے بعد ٹیپ کا بند یہ آتا ہے -

"آج کی دنیا میں سیکولرزم کے لئے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے - آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے، اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے ۔"

شاید خورشید صاحب کو معلوم ہو کہ کیتھولک اسپین کی طرح آج کئی مسلمان ملک بھی ایسے ہیں، جہاں سیاسی اور ریاستی معاملات میں "مذہبی اور نظریاتی غیر جانب داری" نہیں - اور اس نام سے ایک مخصوص مذہبی فرقے کے عقائد کے مطابق کاروبارِ حکومت چلایا جاتا ہے - اس دور میں اگر موصوف "مذہبی اور نظریاتی جانب داری" کو حکومت میں کارفرما کریں گے تو عملاً وہی ہوگا، جو ان مسلمان ملکوں میں ہو رہا ہے - کہیں "اثنا عشریہ" نظریۂ اسلام کی حکومت ہوگی، اور کہیں حنبلی طریقہ فقہ کی ۔ اسی طرح صفحہ ۲۰۴ پر ارشاد ہوتا ہے :- "اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے، اور نہ موروثی شہنشاہیت کو - اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی ہے - - - - نیز اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں" گویا خیال، نظریہ اور عقیدہ کی بنا پر تفوق حاصل

ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو الٰہی ریاست کو کوئی جمہوری نہیں کہے گا۔ اس قسم کا نظام آمرانہ ہی ہوتا ہے۔ جسے آپ نظریاتی آمریت کہہ سکتے ہیں۔ اور نہ اس نظام میں تمام انسان برابر ہوتے ہیں"

آج اس دور میں قومیت کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ کیونکہ زندگی کے ہر موڑ پر، سرکاری ملازمت کے سلسلے میں، کوئی کاروبار شروع کرتے وقت، یا پاسپورٹ لے کر اپنے ملک سے باہر دوسرے ملکوں میں جاتے ہوئے قومیت کا سوال پوچھا جاتا ہے، اور عام طور سے ایک شخص کی قومیت کا تعین اس کے وطن سے ہوتا ہے۔ ایک انڈونیشی خواہ وہ لاکھ مارکس، لینن اور اشتمالیت کو ماننے والا ہو، اس کی قومیت انڈونیشی ہی رہے گی۔ وہ اشتمالی ہونے کی بنا پر روسی یا چینی یا اشتمالی قومیت کا حامل نہیں ہو سکے گا۔ یہ زندگی کی عملی ضرورتوں کا تقاضا ہے اور ہمیشہ سے اسے ملحوظ رکھا جا رہا ہے لیکن خورشید صاحب کے نزدیک نسل، رنگ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اسلام ان سب کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالمگیر نظریہ ہے"

اسلام بے شک ایک عالمگیر نظریہ ہے، لیکن جب اسے ایک ایک وطن اور علاقے کے مسلمان اپنائیں گے تو کیا ہر کسی وجہ سے ان کی ایک مخصوص اور معین قومیت وجود میں نہیں آئے گی، اور وہ مسلمان ہوتے ہوئے پاکستانی، ترکی، ایرانی قومیت کے افراد نہیں ہوں گے۔ اور کیا ایک شخص کے مسلمان ہونے پر اس کی قومیت کی نفی ہو جاتی ہے؟

مرتب نے اسلام کے اصول و مبادی اور افکار و تصورات پر اتنا مفید اور روح پرور مواد فراہم کرنے کے بعد اس سے عملی زندگی کے لئے جو نتائج اخذ کئے ہیں۔ ان سے سوائے اس کے کہ تخیل کی تسکین ہو جائے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسلام کے نام سے ایک فرضی ریاست، ایک فرضی سیاسی نظام اور ایک فرضی قومیت کی دعوت سے موجودہ انتشار بڑھے گا، کم نہیں ہوگا۔ اور جس مقصد کے لئے کتاب لکھی گئی ہے، اس سے یقیناً الٹا نتیجہ نکلے گا۔

ہمارے ائمہ اور فقہا نے مسائل مذہبی میں اجتہاد کے لئے بڑی کڑی شرطیں لگائی تھیں لیکن اس زمانے میں اسلام کے سیاسی و معاشی و معاشرتی نظام کے متعلق اجتہاد کے دروازے جو پٹ کھلے ہیں چنانچہ جس کا جی چاہتا ہے وہ اسلام کے نام سے کبھی جمہوریت کو کفر، کبھی اسے عین اسلام اور کبھی غیر محدود ملکیت کو خدا اور رسول کا حکم اور کبھی اس کی تحدید کو جائز قرار دے دیتا ہے۔ بدقسمتی سے کراچی یونیورسٹی کی اس کتاب میں جو حیثیت

مجموعی ایک مفید کتاب ہے "اسلام کا سیاسی نظام" کے باب میں اس قسم کے اجتہاد کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ جو ایک درسی کتاب میں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ تعلیمی اداروں اور بالخصوص یونیورسٹیوں میں ان مسائل پر ایک خاص مکتبِ خیال کے افکار کی اشاعت جو وقتی اور حزبی سیاست اور مخصوص جماعتی اغراض سے متعلق ہوں ہمارے نزدیک زیادہ سود مند نہیں۔ اور یوں بھی خیال آرائیاں شعر و شاعری کا حسن ہے سیاسی و معاشی نظاموں کی بنیاد ٹھوس حقائق ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

(م۔ س)

شاہ ولی اللہ صاحب کے دلائل میں مابعد الطبیعاتی رجحانات کے ساتھ ساتھ مشاہدات اور تجربات کو بھی خاص دخل ہے۔ ان کی دلیلیں استقرائی اور استخراجی دونوں ہیں۔ گویا کہ وہ مشائی اور اشراقی مکاتیبِ فکر کے سنگم ہیں۔ مثلاً وہ انسانی اجتماعی اداروں کے متعلق غور و خوض کرنے کے لئے استقرائی دلائل دیتے ہیں۔ اور اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ ان اداروں کے قیام کے محرکات کیا تھے۔ پھر ازمنہ قدیم کی تاریخ کو سامنے رکھ کر اس امر کا جائزہ بھی لیتے ہیں کہ یہ اجتماعی ادارے کب وجود میں آئے۔ اور انہوں نے وقتاً فوقتاً کیا کیا روپ دھارے گویا کہ وہ زمانۂ گزشتہ کے تجربات اور اپنے مشاہدات کو بروئے کار لا کر اجتماعِ انسانی کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ان کے دلائل میں عینیت پسندی (IDEALISM) اور حقیقت پسندی (REALISM) کا عجیب و غریب امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ کامل وہ ہے جو جزو سے کل تک پہنچے اور کل سے جزو پر آئے۔ اور دونوں کے تضاد کو دور کرے۔"

مسلمانوں کے سیاسی افکار
مصنفہ پروفیسر رشید احمد